رجسٹرڈ نمبر L. 922
فون نمبر 29

ایڈیٹر
آل احمد سرور

فی کاپی پندرہ پیسے
قیمت سالانہ پانچ روپے
اشاعت کی تاریخیں

۲۲ر دسمبر ۱۹۷۱ء

ہفتہ وار
ہماری زبان

جلد ۳۰ | انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) | شمارہ ۴۸

اداریہ

ہندوستان کی شاندار فتح اور بنگلہ دیش کی آزادی

اردو دوستوں کو بڑی مسرت ہے کہ ہندوستان اس تازہ آزمائش سے کامیاب اور کامران گزرا ہے۔ پاکستان کی فوجی حکومت کو اس کی جارحیت اور بنگلہ دیش کے باشندوں پر ظلم اور جبر کی قرار واقعی سزا ملی ہے۔ بنگلہ دیش آزاد ہے۔ ہندوستان کے جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کے نصب العین کی فتح ہوئی ہے۔ اور اس کی سرحدوں پر سے ہر بیرونی خطرہ دور ہو گیا ہے۔ ہندوستان کی فوجوں اور اس کی حکومت اور اس کے عوام نے بہادری، اتحاد اور عزم کا ثبوت دیا ہے۔ انسانیت، حریت پسندی، رواداری، جمہوریت دوستی، سرخرو ہوئی ہے۔ ہماری وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی رہنمائی میں یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ہندوستان ایک مضبوط اور طاقت ور ملک ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اسے نظر انداز نہیں کر سکتی، نہ اسے اس کے بلند عزائم، مضبوط ارادوں اور اونچے آدرشوں سے ہٹا سکتی ہے۔

ہم تمام اردو دوستوں کی طرف سے اپنی وزیر اعظم کی خدمت میں اس مبارک اور مسعود موقع پر ہدیۂ تہنیت پیش کرتے ہیں۔ ہمیں ان کی رہنمائی، تدبر اور عزم راسخ پر فخر ہے اور ہمیں یہ یقین ہے کہ وہ ملک و قوم کو برابر ترقی اور خوشحالی کی منزل کی طرف لے جائیں گی۔

ہم بنگلہ دیش کے عوام کو ان کی آزادی پر مبارکباد دیتے ہیں۔ انھوں نے یہ آزادی بڑی قربانیوں کے بعد حاصل کی ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہندوستان کی بھرپور مدد ان ستم رسیدہ لوگوں کو مل سکی اور ہم یہ امید کرتے ہیں کہ بنگلہ دیش اور ہندوستان برابر اچھے اور سچے دوست رہیں گے اور ان کی متفقہ کوششوں سے اس برصغیر میں جمہوریت، انسان دوستی، سیکولرزم اور سوشلزم کا پرچم بلند رہے گا۔

ہم ان تمام فوجی افسروں اور جوانوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں جنھوں نے ملک و قوم کے لئے اپنی جان دی اور ان کے پس ماندگان کے غم میں شریک ہیں۔ ہندوستان ان جیالے فوجیوں کے شاندار کارناموں اور ان کی عظیم قربانیوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جنھوں نے اپنے خون سے ہمارے سدا بہار چمن کی آبیاری کی ہے۔

خواجہ غلام السیدین بھی چل بسے

علمی و ادبی حلقوں میں اس خبر کو سن کر بڑا افسوس ہوگا کہ ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین کا ۱۹ر دسمبر کو حرکت قلب بند ہونے سے دلی میں انتقال ہو گیا۔ وہ کچھ روز سے اسپتال میں زیر علاج تھے۔

ڈاکٹر سیدین ایک ممتاز ماہر تعلیم تھے۔ علمی خدمات کے صلے میں ان کو حکومت ہند کی طرف سے پدم بھوشن کا اعزاز بھی ملا تھا۔ مرکزی حکومت میں وہ متعدد تعلیمی مناصب پر بھی فائز رہے۔

وہ ایک بلند پایہ ادیب و مصنف بھی تھے۔ علمی و ادبی مضامین پر مشتمل کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ ان کی کتاب "آندھی میں چراغ" ساہتیہ اکاڈمی کا اعزاز حاصل کر چکی ہے

انجمن ترقی اردو ہند سے مرحوم کا ہمیشہ قریبی تعلق رہا۔ وہ اس کے نائب صدر اور مجلس عام و عاملہ کے اہم رکن کی حیثیت سے آخر دم تک اردو کی خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔

ان کی کتاب "زبان، زندگی اور تعلیم" انجمن کی طرف سے شائع ہو رہی ہے اور چند روز میں منظر عام پر آجائے گی۔ مرحوم نے پسماندگان میں چار لڑکیاں چھوڑی ہیں۔

• ادارہ

خواجہ غلام السیدین کے انتقال پر تعزیتی جلسہ

ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین کی وفات کی خبر پاکر انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے دفتر میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ جس میں مرحوم کی علمی اور ادبی خدمات اور انجمن سے گہرے لگاؤ کا اعتراف کیا گیا اور ایک قرار داد تعزیت منظور کی گئی جس میں مرحوم کے علمی اور ادبی کارناموں کو سراہتے ہوئے ان کی وفات کو ملک کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیا گیا۔ ان کے سوگ میں دفتر آدھے دن کے لیے بند رہا۔

نوٹ:- سیدین صاحب پر سرور صاحب کا مضمون اگلی اشاعت میں آرہا ہے۔

(ادارہ)

سال جون سنہ ء سے اردو ایم۔اے کی کلاس کا آغاز ہو گیا ہے آغاز سال ہی سے طلبہ کی تعداد اٹھائیس ہے جو اس کنڑی علاقہ کے لئے امید افزا ہے۔

• جلیل تنویر دھارواڑ

لسانی اقلیتوں کا کنونشن

حیدرآباد۔ مجلس کل طلبہ برائے اردو کے معتمد جناب انیس کے افضل الدین نے اپنے صحافتی بیان میں کہا ہے کہ حکومت آندھرا پردیش کی موجودہ لسانی پالیسی سے لسانی اقلیتوں کے لئے مشکلات اور مسائل پیدا ہو گئے ہیں اس صورت حال کا جائزہ لینے اور مشترکہ اقدامات کے بارے میں غور کرنے کے لئے لسانی اقلیتوں کے ایک کل جماعتی جلسہ کے انعقاد کی تجویز ہے اس سلسلہ میں وہ لسانی اقلیتوں کے بعض نمائندہ قائدین سے ربط پیدا کر چکے ہیں۔ لسانی اقلیتوں کے دیگر نمائندہ اصحاب سے صلاح مشورہ کے بعد کل جماعتی جلسہ کے پروگرام کو قطعیت دیدی جائے گی۔ اس جلسہ کا مقصد ملازمتوں کے حصول کے لئے تلگو کے لزوم کو برخاست کرانے کے لئے مشترکہ مساعی اور آندھرا پردیش میں لسانی اقلیتوں کے حقوق اور مفادات کا تحفظ ہوگا۔

• رہنمائے دکن

اعلان

ہماری زبان اور اردو ادب کی قیمتوں میں اضافہ

ہماری زبان اور اردو ادب کے معزز خریداروں کی خدمت میں اطلاعاً عرض ہے کہ کاغذ اور پریس کی شرحوں میں اضافہ کی وجہ سے یکم جنوری سنہ ء سے دونوں کی قیمت میں حسب تفصیل ذیل اضافہ کیا گیا ہے۔

۱- ہماری زبان۔ سالانہ قیمت ۶ روپے
فی پرچہ ۲۰ پیسے

۲- اردو ادب۔ سالانہ قیمت پندرہ روپیہ
فی کاپی چار روپیہ

انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ)

اردو اساتذہ کانفرنس ملتوی

لکھنؤ سے پروفیسر نور الحسن ہاشمی سکریٹری استقبالیہ کمیٹی کل ہند یونیورسٹی اردو اساتذہ کانفرنس اطلاع دیتے ہیں کہ جنگ کی وجہ سے کانفرنس کا چوتھا اجلاس جو ۲۵ دسمبر سے ۲۷ دسمبر سنہ ء تک لکھنؤ یونیورسٹی میں ہونے والا تھا ملتوی کر دیا گیا ہے۔ حالات کے نارمل ہونے پر آئندہ تاریخ کا اعلان کیا جائے گا۔

نامہ نگار

آزاد گرلس ہائی اسکول شیموگہ میں انگریزی میڈیم کی جگہ اردو میڈیم

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ شیموگہ آزاد گرلس ہائی اسکول میں انگریزی میڈیم جاری تھا اسے اردو میڈیم سے بدلا جا رہا ہے۔

آزاد گرلس ہائی اسکول شیموگہ کی مجلس منتظمہ اس اقدام پر دلی مبارکباد کی مستحق ہے۔

• تنظیم میسور

کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ میں اردو

کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ ریاست میسور میں اس

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

عربی تنقید میں فنی اصطلاحات کا ارتقاء

یہ حقیقت ہے کہ علمی اصطلاحات اپنے پس منظر میں ایک پوری تاریخی اور ذہنی ارتقا کی داستان رکھتی ہیں۔ اصطلاحات کا اثر زبان اور فن دونوں پر پڑتا ہے اور انھیں سے ان کی وسعت اور عظمت کا اندازہ بھی ہوتا ہے، عربی زبان ایک قدیم اور وسیع زبان ہے جس میں علوم و فنون کی اصطلاحات کا عظیم ذخیرہ موجود ہے فن تنقید عربوں کے یہاں نیا نہیں ہے بلکہ اس کا آغاز عہد جاہلیت ہی سے ہوتا ہے مگر تیسری صدی ہجری سے عربی تنقید کے اصول و مبادی کی تدوین و ترتیب کی ابتدا ہوئی اور اسی دور میں تنقیدی اصطلاحات کے وضع کرنے کا کام بھی شروع ہوا، جاہلی، اسلامی اور اموی ادوار میں تنقیدی اصطلاحات کے وضع کرنے کا شعوری کام نہیں ہوا بلکہ غیر شعوری طور پر تنقید کے ارتقاء کے ساتھ ان کا ارتقاء بھی جاری رہا۔

تیسری صدی ہجری کے ربع آخر سے ادبی تنقید اور اس کی اصطلاحات میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے سب سے پہلے ابوالعباس ثعلب نے بہت سی نئی اصطلاحات وضع کر کے ان کو اپنی کتاب قواعد الشعر میں استعمال کیا۔ ان کے بعد ابن المعتز نے کتاب البدیع لکھی جس میں بہت سی نئی اصطلاحات استعمال کیں۔ چوتھی صدی ہجری میں قدامہ بن جعفر، ابوالحسن اسحاق بن ابراہیم اور پانچویں صدی میں ابو ہلال عسکری اور عبدالقاہر جرجانی نے ادبی تنقید میں اصطلاحات کو منظم و مکمل کیا۔ ان ناقدوں کے علاوہ مشکل سے کوئی ایسا ناقد مل سکے گا جس نے وضع اصطلاحات کا کام کیا ہو۔ پانچویں صدی ہجری کے بعد عربی تنقید میں جمود پیدا ہو گیا اس لئے عصر جدید تک وضع اصطلاحات کا کام بند رہا۔

اب میں تیسری صدی ہجری کے ابتدائی اور بنیادی ناقدین کا ذکر کرتا ہوں جن کے یہاں تنقیدی اصطلاحات ملتی ہیں مگر انھوں نے جو اصطلاحیں استعمال کی ہیں وہ درحقیقت ان کی وضع کردہ نہیں تھیں بلکہ یہ اصطلاحیں شعر کی تنقید کے سلسلہ میں اس دور کی سوسائٹی میں مستعمل تھیں اس لئے کہ تیسری صدی ہجری تک عربی میں کسی ناقد نے نثر کی تنقید کی جانب توجہ نہ کی تھی اس بنا پر اس دور میں جو تنقیدی اصطلاحیں ملتی ہیں وہ شاعری سے متعلق ہیں۔

تنقیدی اصطلاح کے مطالعہ میں سب سے پہلے ہم کو اصمعی (متوفی ۲۲۸ھ) کی کتاب فحولۃ الشعراء ملتی ہے جو دراصل اصمعی کی لکھی ہوئی کتاب نہیں ہے بلکہ ابوحاتم سجستانی نے ان سے کچھ تنقیدی سوالات شعرائے عرب کے بارے میں دریافت کئے تھے اصمعی نے ان کے جو جوابات دیے ان کو انھوں نے قلمبند کر لیا، اور ان کو کتاب کی شکل میں مرتب کر کے اس کا نام "فحولۃ الشعراء" رکھا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں بڑے اور صف اول کے شعراء کے لئے فحول الشعراء کی اصطلاح رائج تھی[1]

ابن سلام کی کتاب طبقات الشعراء میں بہت سی تنقیدی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں انھوں نے فن تنقید کے لئے "نقد" کی اصطلاح استعمال کی ہے اور لکھا ہے کہ جس طرح صراف کو سکوں کی شناخت ہوتی ہے بزاز کو کپڑوں میں مہارت ہوتی ہے اس طرح ناقد کو شعر و ادب میں اہمیت ہے وہ کہتے ہیں کہ نقد خود ایک فن ہے۔ انھوں نے تنقید کے لئے "صنعت" کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے کئی صدیوں تک تنقید کے لئے "صنعت" کا لفظ رائج تھا

[1] فحل کے لغوی معنی نر کے ہیں شاعری میں فحل کا مطلب ہے عظیم شاعر۔ ممکن ہے کہ یہ اصطلاح پہلے رائج رہی ہو۔

نصیر قریشی

غزل

ہم جہاں پھرتے ہیں گنبد کی صدا کی صورت
دیکھ اگر کبھی اس دشت بلا کی صورت

ایک دہشت سی رگ و پے میں جو بھر دیتا تھا
سامنے اب ہے وہی کوہ ندا کی صورت

صاحب جود و سخا، حاتم دوراں تھا کبھی
اب وہی شخص ہے کشکول گدا کی صورت

شیشۂ جسم بھی خوں رنگ نہ ہو جائے کہیں
موسم گل میں ہے خوں رنگ فضا کی صورت

کرب احساس کا جلتا ہوا لمحہ اکثر
دل کے کہساروں میں گونجے ہے صدا کی صورت

تم وہ پیکر کہ ہو رعنائی تخلیق جمال
میں وہ تخلیق، دریدہ ہوں قبا کی صورت

چنانچہ شاعری کی تنقید کو صناعۃ الشعر اور نثر کی تنقید کو صناعۃ الکتابۃ کہا جاتا تھا۔ اسی نام سے ناقدین ادب کتابیں لکھتے تھے مثلاً قدامہ کی کتاب جو نثر کی تنقید سے متعلق ہے اس کا نام ہے صناعۃ الکتابۃ۔ اسی طرح ابو ہلال عسکری نے اپنی کتاب کا نام رکھا تھا کتاب سر الصناعتین۔

تیسری صدی ہجری میں شعراء کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا گیا اور طبقات الشعراء کے نام سے کئی کتابیں لکھی گئیں شعراء کو ان کے دور کے لحاظ سے اصطلاحی نام دئے گئے مثلاً اسلامی، جاہلی اور اموی شعراء وغیرہ۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

الشعراء الجاہلیون:
اس میں وہ شعراء شامل ہیں جو زمانۂ جاہلیت میں پیدا ہوئے اور جاہلیت ہی میں مر گئے یا انھوں نے اسلام کا دور پایا مگر اس میں شاعری نہ کی جیسے حضرت لبید بن ربیعہ تھے جنھوں نے اسلام لانے کے بعد طویل زندگی پائی مگر کوئی شعر نہ کہا اس لئے ان کا شمار زمانۂ جاہلیت میں ہوتا ہے۔

الشعراء المخضرمون:
یہ اصطلاح ان شعراء کے لئے استعمال کی جاتی ہے جو جاہلیت میں بھی شاعری کرتے تھے پھر اسلام لانے کے بعد بھی انھوں نے رسم شاعری جاری رکھی اور اس کو ترک نہیں کیا ان میں حضرت حسان بن ثابت انصاری بہت مشہور ہیں۔

الشعراء اسلامیون: یہ وہ شعراء ہیں جو دور اسلام میں پیدا ہوئے۔

الشعراء المولدون: یہ اصطلاح عصر عباسی کے ان شعراء کے لئے استعمال کی گئی جو عربی و عجمی دونوں ثقافتوں سے کسب فیض کر چکے ہیں عربی و فارسی دونوں زبانیں جانتے تھے۔

عربی شاعری کو مختلف ادوار میں تقسیم کرنے کے لئے مذکورہ اصطلاحات ناقدین ادب نے ایجاد کیں اور اب عربی شاعری کو دور جاہلی، مخضرمی، اسلامی، عباسی (عہد شعرائے مولدین) اور عہد نہضہ (دور جدید) میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

ابن سلام نے "الاشعار المقلدہ" کی اصطلاح ایجاد کی۔ وہ شعر مقلد کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ شعر ایسا مشہور ہو کہ مثل بن گیا ہو۔ ان کا خیال ہے کہ فرزدق کے یہاں سب سے زیادہ اشعار مقلدہ پائے جاتے ہیں[1]

تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں عربوں میں یہ عجیب مرض پھیل گیا تھا کہ لوگ اشعار گڑھ کر کسی قدیم شاعر کی جانب منسوب کر دیتے تھے۔ تنقید کی اصطلاح میں اس کو انتحال کہتے ہیں یہاں انتحال کا ایک واقعہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس کو ابن جراح نے اپنی کتاب الکتاب الورقۃ میں نقل کیا ہے کہ عباس بن احنف نے ہارون الرشید کے دربار میں ایک نہایت شاندار قصیدہ بالکل نئے رنگ میں پڑھا خلیفہ نے پسند کیا مگر کہا کہ اصمعی کو بلاؤ تو ان سے معلوم کیا جائے کہ کلام عرب میں اس کی مثال موجود ہے یا نہیں عباس نے کہا کہ اس کی کوئی مثال موجود نہیں خیر اصمعی آیا تو اس کو قصیدہ سنا کر پوچھا گیا اس نے کہا کہ یا امیر المومنین ایسے بہت سے قصائد کہے گئے ہیں البتہ میں بیت الخلاء میں تھا کہ آپ کے قاصد نے جلدی کی ذرا مجھے اجازت ہو تو میں لوٹ کر ابھی آتا ہوں اور وہ سیدھے بیت الخلاء گیا وہاں اسی رنگ کے اشعار موزوں کئے اور لوٹ کر سنا دیا۔ عباس بن احنف ششدر رہ گئے جب وہ دربار سے نکلا تو انھوں نے اس کو قسم دلا کر پوچھا کہ سچ بتاؤ کیا تم نے یہ قصیدہ باہر نکل کر بنا نہیں لیا ہے اس نے اس کا اعتراف کیا[2]

انتحال کی اصطلاح عربی تنقید میں بہت مروج تھی۔ ابن سلام لکھتے ہیں کہ اکثر وہ لوگ جن کے پاس خاندانی مفاخر کا سامان نہ ہوتا تھا وہ اپنے قبیلہ کی عظمت بڑھانے کے لئے

---

[1] طبقات الشعراء، تالیف ابن سلام ص ۴۸
[2] کتاب الورقۃ از ابو عبد اللہ محمد بن داؤد بن جراح دار المعارف مصر ص ۳۰-۳۱

اشفاق احمد اعظمی

غزل

وہ حبس تھا کہ سینے میں دم ٹھہرتا نہ تھا
چلنے لگی ہوا تو چلی ٹیس کمال کی

کوتاہ قد ہیں لوگ تو سورج ہی کچھ جھکے
اک حد بنائیں آؤ عروج و زوال کی

راتیں اداس زیست پریشاں شکستہ دل
پرچھائیاں دماغوں میں گم گشتہ حال کی

سورج کے سنگ ریزے زمیں پر بکھر گئے
اب زندگی اسیر نہیں ماہ و سال کی

اشفاق آگ سرد نہیں دل ہی سرد ہے
مدھم کسی طرح بھی نہیں لو جمال کی

قصے گڑھ کر کسی قدیم شاعر کی جانب منسوب کر دیا کرتے تھے [1]

ابن سلام نے اپنی کتاب میں سناد، زحاف، اکفاء اور اقویٰ کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں جو عروض میں مستعمل رہیں لیکن ہے کہ یہ ان سے قبل مستعمل رہی ہوں۔

عمرو بن بحر جاحظ نے بہت سی اصطلاحیں اپنی دونوں تنقیدی کتابوں البیان والتبیین اور کتاب الحیوان میں استعمال کی ہیں انھوں نے شاعر اور شویعر وغیرہ کی اصطلاحیں ایجاد کیں جنھیں قبول عام حاصل نہ ہو سکا البتہ ان کی ایک اصطلاح جس کا تفصیلی ذکر آئندہ آئے گا "المذہب الکلامی" کو بڑی شہرت اور قبولیت حاصل ہوئی۔

ابن قتیبہ کو اصطلاحات کے لحاظ سے زیادہ اہمیت حاصل نہیں پھر بھی کچھ اصطلاحات انھوں نے واضح طور پر پیش کی ہیں مثلاً شاعروں کو انھوں نے دو قسموں میں تقسیم کیا ہے ایک کا نام "شاعر متکلف" رکھا ہے اور دوسرے کا نام شاعر مطبوع۔ شاعر متکلف وہ ہے جو بہ تکلف شاعری کرتا ہو مگر شاعر مطبوع کے یہاں آمد کی کیفیت ہوتی ہے، وہ فطری شاعر ہوتا ہے۔ [2]

ابو العباس ثعلب نے اپنی کتاب قواعد الشعر میں بالکل نئی اصطلاحات استعمال کی ہیں جن کے وہ خود موجد ہیں انھوں نے عربی شاعری کو چار قسموں میں تقسیم کیا یعنی امر، نہی، خبر اور استخبار [3] اس کے بعد انھوں نے خوبی اور خامی کے لحاظ سے اشعار کو مندرجۂ ذیل اقسام میں تقسیم کیا اور ہر قسم کے لئے نیا نام یا نئی اصطلاح استعمال کی۔

(۱) المعدل من ابیات الشعر: وہ اشعار جن کے دونوں حصے برابر ہوں اور ہر مصرع کے معنی مکمل ہوں۔

(۲) الابیات الغر: وہ شعر جس کا پہلا مصرع بہت واضح ہو اور دوسرے کے بغیر شعر کی وضاحت کرتا ہو۔

(۳) الابیات المحجلۃ: وہ شعر جس کا آخری حصہ اس کے مقصد کی وضاحت کرتا ہو۔

(۴) الابیات الموضحۃ: جس کے اجزاء وفصول باہم توافق رکھتے ہوں اور فقروں میں اعتدال ہو۔

(۵) الابیات المرجلۃ: جس کا ایک مصرع دوسرے سے اس طرح متصل ہو کہ دونوں کے بغیر معنی صاف نہ نکلتے ہوں [4]

ثعلب کی اصطلاحات میں سے ایک اصطلاح کو بھی قبول عام حاصل نہ ہو سکا اور ان کے بعد کے ناقدوں نے ان کی تمام اصطلاحات کو قطعاً نظر انداز کر دیا۔ ڈاکٹر محمد مندور رقم طراز ہیں کہ ثعلب کی اصطلاحات اور شعر کی تقاسیم میں کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ انھوں نے بلا سوچے سمجھے یہ اصطلاحات وضع کیں جو بے معنی تھیں لہٰذا انھیں قبول عام حاصل نہ ہو سکا [1]

میرا خیال ہے کہ ثعلب کی تنقیدی اصطلاحات کی نامقبولیت کا اصل سبب یہ ہے کہ انھوں نے اشعار کی تقسیم سطحی انداز سے کی ہے مثلاً اگر کسی شعر میں کوئی حکم پایا جائے تو انھوں نے اس کو "امر" کہہ دیا اور کسی امر کی ممانعت پائی جائے تو اس کا نام انھوں نے شعر نہی رکھ دیا۔ یہ ایک ایسی تقسیم ہے جس کی ضرورت نہ تھی اور اس کے سطحی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اگر ثعلب نے یہ اصطلاحات اور تقاسیم معانی اور تجربات کے وسیع تصورات کو پیش نظر رکھ کر کی ہوتیں تو یہ یقیناً کامیاب ہوتیں جیسا کہ ان کے بعد ابن المعتز اور قدامہ بن جعفر کی تنقیدی اصطلاحات کو عربوں میں قبول عام حاصل ہوا۔

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ابن معتز نے سب سے پہلے علم بدیع پر قلم اٹھایا مگر حقیقت یہ ہے کہ ثعلب نے تشبیہ و استعارہ پر کافی بحثیں کی ہیں مگر انھوں نے اپنی کتاب میں تنقیدی اصطلاحات وضع کرتے وقت یونانی علوم و فنون کی جانب توجہ نہیں کی۔ اس کے برعکس ابن معتز نے اپنی تصنیف کتاب البدیع میں بالکل نئی اصطلاحات استعمال کی ہیں وہ اس علم کو پانچ قسموں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(۱) طباق (۲) جناس (۳) استعارہ (۴) رد الاعجاز علی ما تقدمہا (۵) المذہب الکلامی۔

ابن معتز کہتے ہیں کہ پہلی چار اصطلاحیں انھوں نے خود وضع کی ہیں مگر پانچویں اصطلاح یعنی مذہب کلامی انھوں نے جاحظ سے مستعار لی ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ ابن معتز کی ان تنقیدی اصطلاحات کا ماخذ کیا ہے؟ ان تعریفات کا مرجع وہ خود ہیں یا اس سلسلہ میں ان کو کہیں سے روشنی ملی ہے؟ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے یہ شبہ ظاہر کیا ہے کہ یہ اصطلاحات ممکن ہے کہ ابن معتز نے یونانی اثرات کے زیر اثر استعمال کی ہوں [2] مگر ڈاکٹر محمد مندور نے صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ علم بدیع کے پانچ عناصر میں سے چار چار کی تعریفات ابن معتز نے ارسطو کی کتاب الشعر و کتاب الخطابت سے حاصل کی ہیں [3] چونکہ عرب

---

[1] طبقات الشعراء از ابن سلام ص ۱۴

[2] الشعر والشعراء ج ۱ ص ۲۲

[3] قواعد الشعر تالیف ابو العباس ثعلب ص ۱۸

[4] " " ص ۷۴، ۷۱، ۷۵، ۷۸، ۸۹

[1] النقد المنہجی عند العرب تالیف ڈاکٹر محمد مندور ص ۳، ۴۳ - ۳۴، ۳۷

[2] نقد النثر از قدامہ بن جعفر بالحظ ہو مقدمہ از طٰہٰ حسین دار الکتب المصریۃ

[3] النقد المنہجی عند العرب ص ۵۹

شعر و ادب میں دوسری قوموں سے کسب فیض کو ناپسند کرتے تھے اور اپنے کو شاعری میں دنیا کی تمام قوموں سے افضل تصور کرتے تھے اس لئے انھوں نے اہل یونان کے علوم نقل کئے مگر ان کی شاعری سے تعرض نہ کیا۔ کتاب الشعر اور کتاب الخطابت دراصل اس دور میں ارسطو کی منطق کی کتابوں میں شامل تھیں اسی لئے آج بھی ابن سینا کی کتاب الشفا میں یہ دونوں کتابیں موجود ہیں۔ اس طرح منطق و فلسفہ کے بہانے یہ عمدہ کارنامے عربی میں منتقل ہوئے اور انھیں کے ذریعہ عربی میں نئی تنقیدی اصطلاحات نے جنم لیا۔ البتہ ابن معتز نے عربوں کا ایک نفسیاتی علاج کیا اس نے ایک طرف تو یہ ظاہر نہ کیا کہ اس کی اصطلاحات کا ماخذ ارسطو کے افکار ہیں اور دوسری طرف یہ بتانے کی کوشش کی کہ یہ تمام باتیں ہمارے یہاں پہلے سے موجود تھیں قرآن، حدیث اور کلام عرب سے اس نے (ارسطو کی اصطلاحات کے ترجمے کرکے اس کے لئے) استشہاد کیا جس کی وجہ سے اس کی اصطلاحات کو عربوں میں قبول عام حاصل ہوا۔

مذکورہ ۵ اقسام بدیع کے علاوہ ابن معتز نے محاسن شعری کی تیرہ قسمیں اور بھی پیش کی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) الالتفات
(۲) الاعتراض
(۳) الرجوع
(۴) الخروج من معنی الی معنی
(۵) تاکید المدح بما یشبہ الذم
(۶) تجاہل العارف
(۷) ہزل یراد بہ جد
(۸) حسن التضمین
(۹) التعریض والکنایۃ
(۱۰) الافراط فی الصفۃ
(۱۱) حسن التشبیہ
(۱۲) اعنات الشاعر نفسہ فی القوافی
(۱۳) حسن الابتداءات

ان اصطلاحات میں اکثر ارسطو سے ماخوذ ہیں مگر بعض عربوں میں رائج تھیں ابن معتز کی اصطلاحات کو عربوں نے قبول کیا اس کے برعکس قدامہ بن جعفر کی بعض اصطلاحوں کو انھوں نے رد کر دیا پھر بھی قدامہ کی اصطلاحیں عربوں کو مجبوراً قبول کرنی پڑیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا کوئی بدل موجود نہ تھا۔ اس لئے کہ ابن معتز نے تو صرف چند اصطلاحات پیش کی ہیں باقی پوری تنقیدی اصطلاحات سے تعرض نہیں کیا ہے لیکن اس کے برعکس قدامہ نے پوری عربی شاعری کا ایک منظم، مربوط اور سائنٹیفک مطالعہ کیا اور غور و فکر سے اس کے تمام پہلوؤں کا استقصا کیا۔ اس نے ہیئت اور مواد دونوں پر مفصل بحثیں کیں اور تمام اصناف سخن پر الگ الگ روشنی ڈالی۔ اس نے نثر پر بھی ایک کتاب صناعۃ الکتابۃ کے نام سے لکھی۔ اس طرح قدامہ نے نئی نئی تنقیدی اصطلاحات سے عربی تنقید کو مالا مال کر دیا۔

(باقی آئندہ)

(صفحہ ۸ سے آگے)

میں "میں" کے بارے میں زیادہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ قرأت مصنف کے اصل متن سے قریب تر ہوگی۔ موصوف کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ لفظ "نکارا" پر "نقارا" کو ترجیح کیوں دی گئی جبکہ "نکارا" نسخہ ۹ میں ملتا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ دس نسخوں میں سے صرف ایک نسخے میں لفظ "نکارا" آیا ہے اور باقی نو نسخوں میں جو قرأت پائی جاتی ہے وہ "نقارا" ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس کاتب نے نسخہ ۹ نقل کیا ہے اس نے جان بوجھ کر یا سہواً "ق" کو "ک" سے بدل دیا ہے۔ صرف ایک نسخے میں "نکارا" آنے سے باقی نو نسخوں کی قرأت کی شہادت کو رد نہیں کیا جا سکتا اور نہ وثوق کے ساتھ یہی کہا جا سکتا ہے کہ مصنف نے اپنے متن میں "نکارا" ہی استعمال کیا ہوگا اگرچہ یہ لفظ بنیادی نسخے میں ہی کیوں نہ آیا ہو۔ "ق" کی جگہ پر "ک" کے استعمال کی کوئی اور مثال بکٹ کہانی میں نہیں پائی جاتی ہے جس سے کہ اس قرأت کی تصدیق ہوتی ہو جبکہ قصہ، عقل، عشق، قول، فراق، نقیں، حلقہ، قید، قیامت، یقین اور اسی طرح کے دوسرے بہت سے ایسے الفاظ بکٹ کہانی میں آئے ہیں جن میں "ق" صحت کے ساتھ استعمال ہوا ہے اور کسی ایک مقام پر بھی "ق" کو "ک" سے نہیں بدلا گیا ہے۔ ان اصولوں کی بنا پر دوسری اور بھی قرأتوں کے بارے میں یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ مصنف کے متن سے قریب تر قرأت کیا ہو سکتی ہے۔ افضل کے نام اور اس کے وطن کے بارے میں ڈاکٹر محمد انصار اللہ نے جو غلط فہمیاں اب تک پھیلائی تھیں ڈاکٹر عبدالغفار شکیل کے مضمون سے جب ان کا مدلل اور بھرپور جواب مل گیا تو موصوف نے بکٹ کہانی کے متن کے بارے میں غلط فہمی پھیلانے کی ناکام کوشش شروع کر دی جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ موصوف "تصحیح شدہ" اور "تشکیل شدہ" متن کے فرق سے واقف نہیں۔ بکٹ کہانی کا موجودہ متن دریافت شدہ نسخوں میں سے کسی ایک نسخے یا صرف [illegible] کے نسخے کا متن نہیں ہے بلکہ یہ ان تمام نسخوں کو سامنے رکھ کر تشکیل کیا گیا (RECONSTRUCTED) متن ہے۔

علی گڑھ۔ — مرزا خلیل احمد بیگ

مراسلات

اردو کی بقا و ترقی میں مدارس کا رول

اردو کی بقا اور اس کا تحفظ صرف اس کے بولنے والوں کی تعداد اور اس کے رسائل و اخبار کی کثرت پر نہیں اور نہ ہی فلمی گیتوں پر ہے۔ کسی زبان کا وجود اس وقت پائیدار ہوتا ہے جبکہ مدارس میں اس کی زیادہ سے زیادہ مانگ ہو۔ مدارس میں اردو طلبہ کی کثرت ہی اردو کی بقا و تحفظ کی ضامن ہے اس لئے ہماری زیادہ تر توجہ مدارس میں اردو طلبہ کی تعداد میں اضافہ کی طرف ہونی چاہئے۔ مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ دیہی علاقوں میں اردو بتدریج روبزوال ہے۔ اگرچہ بیشتر طلبہ کی مادری زبان اردو ہے مگر محض علاقائی تعصب کے دباؤ پر اپنی مادری زبان چھوڑ کر علاقائی زبان کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے اور یہ سلسلہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔

رہا شہروں کا معاملہ تو وہاں اگرچہ اردو طلبہ کی تعداد بہ نسبت دیہی علاقوں کے زیادہ ہے مگر تدریس و تعلیم کی خامیوں کی وجہ سے وہاں بھی اردو روبانحطاط ہے۔ جو طلبہ اردو میڈیم سے میٹرک پاس کرتے ہیں ان کا نہ املا صحیح ہے اور نہ تلفظ درست۔ بلکہ اردو سے بے اعتنائی برتنے کو ایک فیشن سمجھا جانے لگا ہے اس میں اردو اساتذہ کی سہل انگاری کو بھی بڑا دخل ہے۔ وہ طلبہ میں اردو سے وہ دلچسپی پیدا نہیں کرسکے جو اس کی مقبولیت کے لئے ضروری تھی۔ اساتذہ اپنے عمل سے اردو کے مستقبل کو روشن بھی بنا سکتے ہیں اور تاریک بھی۔ اس لئے اب ضرورت ہے کہ اردو کے ہر علاقہ میں پرائمری سے لے کر ہائی اسکول تک پڑھانے والے اردو اساتذہ کو مقررہ مقام اور مقررہ تاریخ پر جمع کیا جائے اور مل بیٹھ کر سوچا جائے کہ اردو کے تحفظ و ترقی کے لئے وہ کیا لائحہ عمل اختیار کریں۔

میری رائے میں پرائمری اسٹیج سے ہی بچوں کے دلوں میں اردو سے محبت اور وابستگی کا احساس پیدا کرنا ضروری ہے۔ اگرچہ یہ کام خاصہ دشوار ہے مگر اردو کی بقا کے لئے ایسا کرنا ناگزیر ہے۔ املا کی مسلسل مشقیں کرائی جائیں اور صحیح تلفظ پر زیادہ سے زیادہ زور دیا جائے۔ چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی کتابیں پڑھا کر بچوں کو اردو کے اظہار بیان کے طریقوں سے واقف کرایا جائے۔

وسطانی اور ہائی اسکول سطح پر طلبہ کسی حد تک باشعور ہوتے ہیں ان کے دلوں میں اردو کی محبت پیدا کی جائے۔ ان کو اردو کی اہمیت سے واقف کرایا جائے اور اردو اخبارمینی اور رسائل کے مطالعہ پر اکسایا جائے۔ طلبہ کی ایک مجلس بنا کر ان کی نگرانی میں لائبریری کا قیام عمل میں لایا جائے۔

ملک میں ان گنت ادارے ہیں جو اردو کی ترویج و ترقی کے لئے کوشاں ہیں۔ لیکن میرے نزدیک سب سے اہم ادارہ مدرسہ ہے۔ اگر اردو کے اساتذہ دلچسپی، لگن اور محنت سے اردو کی تعلیم دیں تو اردو روز بروز ترقی کی منزلوں کو طے کرنے لگے کیونکہ اساتذہ سے بڑھ کر اردو کی خدمت کا فریضہ اور کوئی انجام نہیں دے سکتا۔

طلبہ میں اردو کی محبت اور اس سے دلچسپی صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جبکہ ان کی تحریری صلاحیتوں کو اجاگر کیا جائے۔ اس کے لئے تحریری اور تقریری مقابلے منعقد کئے جائیں۔ ابتدا میں معمولی موضوعات پر لکھوایا جائے پھر رفتہ رفتہ معیاری مضامین دیے جائیں اور بہترین مضامین پر انعامات دیے جائیں۔ ان مقابلوں سے طلبہ کی تحریری اور تقریری صلاحیتوں کو بروئے کار آنے کا موقع ملے گا۔ اساتذہ ہی ان صلاحیتوں کے ابھارنے میں اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔

حقیقت اب ہم سب پر واضح ہو جانا چاہئے کہ اردو کی کشتی کو اب ہمیں خود کھینا ہے اب حکومت یا کسی سرکاری ادارے پر تکیہ کرنے کا وقت نہیں اس لئے سب کو متحد ہو کر اجتماعی طور پر اپنے اپنے ذرائع سے اردو کی ترویج و ترقی میں جدوجہد کرنا ہے۔

ایک دفعہ پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا تھا "کسی قوم کو مٹانا ہو تو اس کی زبان کو مٹا دیا جائے اور زبان کو مٹانا ہو تو اس کا رسم الخط بدل دیا جائے"۔ چنانچہ اردو کو مٹانے کے لئے بعض حلقوں میں اسی قسم کی سازشیں ہو رہی ہیں۔ اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی اردو اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ آسان طریقہ سے بچوں کو اردو املا سے واقف کرائیں۔ املا ہی تحریر کی بنیاد ہے اور تحریر ہی زبان کے قائم رکھنے کا ذریعہ ہے۔

جلیل تنویر
دھارواڑ۔

بکٹ کہانی کے متن کے بارے میں

ہماری زبان (یکم دسمبر ۱۹۷۸ء) میں "بکٹ کہانی" سے متعلق ڈاکٹر محمد انصار اللہ کا مراسلہ جو انھوں نے ڈاکٹر عبدالغفار شکیل کے مضمون (مطبوعہ فکر و نظر) اور راقم الحروف کے مراسلے (ہماری زبان ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۸ء) کے جواب میں لکھا تھا نظر سے

گزرا۔ موصوف نے افضل کے نام اور اس کے وطن کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیوں کے بعد اب بکٹ کہانی کے متن کو بھی بہر طور مسخ شدہ قرار دے دیا۔ ظاہر ہے یہ حکم متنی تنقید اور تشکیل متن کے اصولوں سے ناواقفیت کی بنا پر ہی لگایا گیا۔ اس سلسلے میں، چند باتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا۔

اگر کسی ادبی تصنیف کا صرف ایک ہی نسخہ دریافت ہوا ہے تو اس کی ترتیب میں کافی آسانی ہوتی ہے اور مرتب کو مصنف کے اصل متن تک پہنچنے کے لئے زیادہ چھان بین کی ضرورت پیش نہیں آتی اور نہ ہی اصل متن کے تعین میں متنی تنقید کے بہت سے پیچیدہ مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور صرف قیاسی تصحیح سے کام چل جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی تصنیف کے کئی نسخے دریافت ہوئے ہوں تو دستیاب شدہ نسخوں کی مدد سے متن کی ترتیب کا کام خاصا دشوار ہو جاتا ہے۔ بکٹ کہانی کے ایک دو نہیں بلکہ مطبوعہ نسخے (م) اور نسخۂ شیرانی (ش) کو شامل کر کے کل بارہ نسخے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر نسخہ اپنی جگہ پر اہمیت رکھتا ہے۔ ان میں سے اب تک کسی کے بارے میں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ (AUTOGRAPH) ہے۔ جس طرح اب تک یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ ان میں سے کونسا نسخہ مصنف کا اصل متن ہے اسی طرح اس بات کی بھی اب تک تصدیق نہیں ہو سکی کہ ان میں سے کونسا نسخہ سب سے قدیم یا مصنف کے متن سے قدیم تر ہے یا کونسا نسخہ کس نسخے کی نقل ہے۔ دس نسخوں میں سے صرف تین پر سنہ کتابت درج ہے۔ ان تینوں نسخوں میں تاریخ کے اعتبار سے گڑھ مکتیشر کا نسخہ (نسخہ عث) سب سے قدیم ہے۔ لیکن وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ بکٹ کہانی کے دریافت شدہ تمام نسخوں میں یہی نسخہ قدیم ترین ہوگا۔ ممکن ہے کہ ان ساتوں نسخوں میں سے جن پر سنہ کتابت درج نہیں ہے کوئی نسخہ سب سے قدیم ہو اور اس سے گڑھ مکتیشر کا نسخہ یا اور دوسرے نسخے نقل کئے گئے ہوں۔ ایسی صورت میں جبکہ اس بات کا تعین نہیں ہو سکا کہ مصنف کا متن یا سب سے قدیم نسخہ کونسا ہے ہر نسخے کو اہمیت دینا لازمی ہے اور صحیح و معتبر اور مصنف کے اصل متن سے قریب تر متن اسی وقت تیار ہو سکتا ہے جبکہ دریافت شدہ تمام نسخوں کو تشکیل متن کے وقت سامنے رکھ کر ان میں سے ہر ایک سے استفادہ کیا جائے۔

دو یا دو سے زیادہ نسخے دریافت ہونے کی صورت میں کسی ایک نسخے کو بنیادی نسخہ ضرور بنایا جاتا ہے اس کے علاوہ دیگر تمام نسخے مقابلے کے کام آتے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر کاتب کے قلم سے جو غلطیاں اور مہمل باتیں نسخے میں راہ پاگئی ہوں انھیں بنیادی نسخے کے نام پر زیر ترتیب متن میں ہو بہو نقل کر دیا جائے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ایک نسخے سے دوسرے نسخے کو نقل کرنے میں کاتب مختلف قسم کی چھوٹی بڑی غلطیاں کرتا ہے۔ وہ اپنی طرف سے کہیں کچھ اضافہ کرتا ہے، کہیں کچھ حذف کر دیتا ہے اور کہیں کچھ کا کچھ لکھ جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ایک نسخہ نقل کرنے میں کاتب سے تقریباً چار فیصد غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ اس طرح مصنف کے متن کو اگر مختلف زمانوں میں یکے بعد دیگرے پانچ کاتبوں نے نقل کیا ہے تو پانچویں نسخے میں بیس فیصد اغلاط کا پایا جانا لازمی ہے۔ بعض اوقات مصنف کے دستخط شدہ نسخے میں بھی کچھ غلطیاں رہ جاتی ہیں لہذا متنی نقاد مصنف کے اصل متن کو بھی بعینہٖ نہیں چھاپ سکتا چہ جائیکہ کاتب کا نقل کیا ہوا نسخہ جس میں غلطیوں کے بے حد امکانات ہوتے ہیں۔

"بکٹ کہانی" کا جو نسخہ پروفیسر نورالحسن ہاشمی اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ترتیب دیا ہے اس میں گڑھ مکتیشر کے نسخے کو بنیادی اہمیت ضرور حاصل ہے لیکن جہاں جہاں ضرورت پڑی ہے الفاظ اور فقروں کی تبدیلی سے گریز نہیں کیا گیا ہے۔ اس نسخے میں بہت سے الفاظ اور فقرے ایسے آئے ہیں جو شعر میں غلط مبہم اور مہمل معلوم ہوتے ہیں اور بہت سی قرائتیں ایسی موجود ہیں جو افضل کے دور کی زبان سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ اس طرح کی قرأتوں کو زیر ترتیب متن میں جوں کا توں لکھ دیا جاتا۔ بکٹ کہانی کے موجودہ متن کو ترتیب دیتے وقت قرأتوں کے انتخاب میں جن باتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے وہ یہ ہیں: (۱) جس قرأت کا انتخاب کیا جائے وہ افضل کے دور کی زبان سے مطابقت رکھتی ہو (۲) وہ قرأت بیشتر نسخوں میں پائی جاتی ہو (۳) بامعنی ہو مہمل نہ ہو (۴) اور وزن کے لحاظ سے بحر میں آسکتی ہو (۵) ان کے علاوہ قدیم ترین نسخے سے اس کی شہادت ملتی ہو۔ موصوف کا اعتراض ہے کہ شعر ۳۵ میں "توں حال میرا" (جو گڑھ مکتیشر کے نسخے میں ملتا ہے) پر ایک دوسری قرأت "ہیں حال میرا" کو کیوں ترجیح دی گئی اور اس تبدیلی کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ "ہیں" رکھ کر شعر پڑھنے سے شعر کا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے مثلاً: "خدارا اے صبا ہیں حال میرا" جبکہ توں کے ساتھ شعر پڑھنے سے اس کا مطلب بالکل خبط ہو جاتا ہے ملاحظہ ہو: "خدارا اے صبا توں حال میرا" اس کے علاوہ "توں" گیارہ نسخوں میں صرف دو نسخوں (نسخہ عک اور عث) میں ہی آیا ہے جبکہ نو نسخوں میں "ہیں" ملتا ہے۔ اس طرح اکثریت بھی "ہیں" کی ہے اور مفہوم کے اعتبار سے بھی یہ قرأت نہایت موزوں ہے۔ لہذا "توں" کے مقابلے

باقی صفحہ ۷ پر

انجمن کی خبریں

پاکستانی جارحیت کی مذمت

حیدرآباد:۔ جناب حبیب الرحمٰن سکریٹری انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لینے اور حکومت ہند کے فیصلہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ ان کی انجمن کے رکن قلم کار و شعراء کبھی ہندوستان پر پاکستان کے جارحانہ اقدامات کو شکست فاش دینے میں حکومت ہند کی بھرپور تائید کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ حکومت ہند پاکستان کے جارحانہ حملوں کے خلاف جائز اور حق بجانب اقدامات کر رہی ہے، قلم کار اور شعراء ہندوستان کی سالمیت اور یگانگت کی برقراری کے لئے ہر وہ قدم اٹھانے سے گریز نہیں کریں گے جو ان کے امکان میں ہے جناب حبیب الرحمٰن نے ریاست کے اردو قلم کاروں اور شعراء سے دفاع کے موضوع پر نثری و شعری ادب پیش کرنے کی پرزور اپیل کی تاکہ جوانوں اور عوام کے حوصلے بلند رہیں۔

• رہنمائے دکن

(۲)

عادل آباد:۔ انجمن ترقی اردو عادل آباد کے عہدہ داروں و ممبروں نے حسب ذیل بیان جاری کیا ہے۔ پاکستان کے جارحانہ اقدام کی وجہ سے اس آزمائشی دور میں ادیبوں اور شاعروں کو چاہیے کہ دفاع کے تعلق سے اپنے مضامین اور اشعار لکھ کر بہادر سپاہیوں کی ہمت افزائی کریں بیان میں کہا گیا ہے کہ حکومت ہند نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے بڑی دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔

• رہنمائے دکن

(۳)

نظام آباد:۔ مجلس انتظامی انجمن ترقی اردو شاخ نظام آباد کا اجلاس مولوی حافظ عبدالکریم صدر مقامی انجمن کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعہ ملک کی سلامتی کے لئے وزیر اعظم کی پالیسی اور ان کی مساعی کی کامل حمایت اور پاکستانی جارحیت کی بھی شدید مذمت کی گئی۔ اجلاس میں یہ طے پایا کہ مرکزی انجمن کے سالانہ اجلاس میں سال ۱۹۷۲ء کا جلسہ نظام آباد میں منعقد کرنے کی دعوت دی جائے جناب غلام نبی نصرت معتمد نے شکریہ ادا کیا۔

• سیاست حیدرآباد

بنگلہ دیش کی آزادی پر اظہار مسرت

علی گڑھ:۔ بنگلہ دیش کی آزادی کی خوشی میں مرکزی انجمن ترقی اردو ہند کے کارکنوں کا ایک جلسہ انجمن کے دفتر میں زیر صدارت جناب ڈاکٹر سید ناصر حسین نقوی نائب معتمد منعقد ہوا۔ اس موقع پر کارکنوں نے انتہا مسرت و انبساط کا مظاہرہ کیا۔ اور بنگلہ دیش کی حکومت کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے اس سلسلہ میں اپنی حکومت کے ہر اقدام اور پالیسی کی بھرپور تائید اور حمایت کی آخر میں مٹھائی کی تقسیم اور چائے کے بعد جلسہ کا اختتام ہوا۔

• ادارہ

انجمن ترقی اردو کا سالانہ اجتماع ملتوی

حیدرآباد:۔ جناب سرینواس لاہوٹی معتمد تنظیم انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے اپنے صحافتی بیان میں اعلان کیا کہ انجمن کا مجوزہ سالانہ اجتماع جو ۸ اور ۹ جنوری کو منعقد ہونے والا تھا ہنگامی صورت حال کے پیش نظر کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دیا گیا ہے نئی تاریخوں کا بعد میں اعلان کیا جائے گا۔ جناب سرینواس لاہوٹی نے اپنے بیان میں ضلاعی شاخوں سے اپیل کی ہے کہ وہ مقامی اجتماعات کو ملتوی نہ کریں بلکہ انھیں جاری رکھیں۔

• سیاست حیدرآباد



اخبار و اذکار

پروفیسر کلیم الدین احمد اور پروفیسر احتشام حسین کو استقبالیہ

شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی انجمن اردوئے معلّٰی کی طرف سے ۵ دسمبر ۱۹۸۳ء کی سہ پہر کو فیکلٹی آف آرٹس لاؤنج میں پروفیسر کلیم الدین احمد اور پروفیسر سید احتشام حسین کو ایک استقبالیہ دیا گیا۔

صدر شعبۂ اردو، پروفیسر آل احمد سرور نے اپنی تعارفی تقریر میں فرمایا کہ کلیم الدین احمد صاحب اور احتشام صاحب اردو تنقید میں جو ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اس کے پیش نظر کسی رسمی تعارف کی ضرورت نہیں۔ ادب کا ہر طالب علم ان کے کارناموں سے اچھی طرح واقف ہے اور طلبہ کی کئی نسلوں نے ان سے اکتساب فیض کیا ہے کلیم صاحب کا تعارف سرور صاحب نے فلابیر کے اس قول سے شروع کیا کہ اگر کسی کو تحریر میں اپنا اظہار کرنے کی جستجو ہے تو اُسے خاموش رہنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ کلیم صاحب کی کم گوئی ایک ضرب المثل بن چکی ہے۔ لیکن ان کی تحریر کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سہ ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں، کلیم صاحب کی تنقیدی نظر کا شکار ہونے سے کوئی بھی نہیں بچ سکا۔ لیکن قابل قدر بات یہ ہے کہ شعر و ادب کی تنقید میں ان سے ذاتی کاوش سے اختلاف کے باوجود اس کے علمی وزن و وقار اس کی سنجیدگی اور افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ اختلافات زندگی کی علامت ہیں بشرطیکہ ان کی بنیاد خلوص، متانت اور علم پر ہو۔

کلیم صاحب نے اس موقع پر بھی اپنی خاموشی کی روایت برقرار رکھی۔ جوابی تقریر میں احتشام صاحب نے اپنی اور کلیم صاحب کی جانب سے اس جلسے کے انعقاد پر انجمن اردوئے معلّٰی کا شکریہ ادا کیا۔ احتشام صاحب نے فرمایا کہ کلیم صاحب تقریباً تیس برس بعد علی گڑھ آئے ہیں اور میں تقریباً ہر تیسرے دوسرے کسی نہ کسی سلسلے میں یہاں آتا رہتا ہوں۔ علی گڑھ آکر سب سے زیادہ اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ یہاں اردو کے لئے وہ فضا اور سہولتیں میسر ہیں جو بعض وجوہ سے ملک کی دوسری یونیورسٹیوں میں نظر نہیں آتیں۔ یہاں مختلف سماجی علوم سے تعلق رکھنے والے بہت سے ایسے لوگ ایک ساتھ موجود ہیں جو اردو کو ذریعۂ اظہار بنا کر اپنے موضوع سے متعلق علمی سرمایہ اردو کو دے سکتے ہیں۔ ہمیں چھوٹی چھوٹی حد بندیوں سے نکل کر اردو کی بقا اور تحفظ کے لئے اردو کو ایک ترقی یافتہ علمی زبان بنانے کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ کوئی بھی زبان صرف ادب کی زبان بن کر زندہ نہیں رہ سکتی۔

جلسے کے خاتمے پر انجمن کے سکریٹری جناب الطاف حسین رنی (متعلم ایم۔ اے فائنل) نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

تقریر پر آمادہ نہیں ہوسکے تھے لیکن علی گڑھ سے واپس پٹنہ پہنچنے کے بعد انھوں نے سرور صاحب کے نام ایک خط بھیجا تھا اس جلسے کے بارے میں اپنے تاثرات بھی لکھ بھیجے۔ انھوں نے لکھا کہ: آپ کی انجمن نے جس خلوص کے ساتھ احتشام صاحب کا اور میرا خیر مقدم کیا اس سے میں بہت متاثر ہوا۔ سرور صاحب نے اپنی مختصر لیکن دلچسپ تقریر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ میرے ناوک نے کسی کو نہیں چھوڑا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ لکھا اور جو کچھ لکھتا ہوں تو اس کا مقصد نہ تو کسی کی دل شکنی ہے اور نہ اردو ادب کی تحقیر، بات تو یہ ہے کہ میرے سامنے عالمی ادب ہے اور میرا خیال ہے کہ ابھی اردو ادب کا عالمی ادب میں کوئی خاص مقام نہیں۔ میں لکھتا ہوں تو اس لئے کہ اردو لکھنے پڑھنے والے اس حقیقت کو سمجھیں اور ان کے دلوں میں یہ امنگ پیدا ہو کہ وہ اردو ادب کے لئے عالمی ادب میں ایک ممتاز جگہ بنائیں۔ میں احتشام صاحب کی اس رائے سے متفق ہوں کہ علی گڑھ میں اس کام کے لئے فضا ساز گار ہے، کام کرنے والوں کی بھی کمی نہیں اور پھر ہر طرح کی سہولتیں بھی موجود ہیں۔ مجھے شکوہ ہے تو اس بات کا کہ جتنا کام اور جس بلند پایہ کا کام ہو سکتا ہے وہ کسی وجہ سے نہیں ہو پاتا۔ آپ نے فرمائش کی تھی کہ میں اپنے کچھ اشعار آپ کو سناؤں بات یہ ہے کہ میں مشاعرے یا کسی محفل میں یہاں تک کہ اپنے عزیزوں اور احباب کو بھی اپنی نظمیں نہیں سناتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے آپ کی فرمائش رد کردی جس کا مجھے صدمہ ہے۔ میں شعر و نظم کو تفریح کا ذریعہ نہیں سمجھتا۔ شعر و نظم لکھنے سننے اور سمجھنے کے لئے توجہ ضروری ہے۔ میں نے نظمیں لکھی ہیں لیکن اپنے شعروں کی جگہ میں HOPKINS کی ایک مشہور نظم کی تین سطریں پیش کرتا ہوں:

O THE MIND, MIND HAS MOUNTAINS,
CLIFFS OF FALL FRIGHTFUL, SHEER, NO-
MAN FATHOMED. HOLD THIN CHEAP MAY
NE'ER HUNG THERE.

مجھے کہنے دیجئے کہ میری نظموں میں کچھ اسی قسم کا چیلنج ہے جس کو پڑھنے والے پڑھیں ورنہ لائبریری کے شلف پر گرد کی تہیں جمنے دیں۔

میں پھر آپ سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ سے ملنے اور تبادلۂ خیالات کرنے کے مواقع ملتے رہیں گے

یت علی شاعر، عبدالرؤف عروج، غلام جیلانی اور یوسف لم جیسے ادیب شاعر وہاں جمع تھے (تو وہ اردو میں انور معظم، ن یوسف زبیری، بشر نواز اور شفیق فاطمہ شعریٰ) ادبی دنیا سے یارف ہو رہے تھے۔ اسی زمانے میں قاضی سلیم اپنی تعلیم کی کے بعد اورنگ آباد آئے اور اپنے والد قاضی حمیدالدین حب کے ساتھ، جو اورنگ آباد کے سرکردہ ماہر قانون اور یں، وکالت شروع کی۔ سلیم کی آمد نے ادیبوں کے منتشر گروہ "حلقۂ ادب" کی صورت میں یکجا کیا۔ اس حلقے کی صدارت میرے سپرد ہوئی، مگر اس کی سرگرمیوں کے محرک اصل میں قاضی سلیم ہی رہے۔ اس وقت انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی بھی۔ الملتفانہ تحریک شباب پر تھی اور ترقی پسندی لکھنے والوں کا مطمح نظر تھی اور ادبی سیاسی نظریہ بھی۔

قاضی سلیم ترقی پسندی سے نظریاتی وابستگی کے باوجود نظمیں مانے کے مروجہ و مقبول انداز سے ہٹ کر لکھتے تھے ے حلقے کی نشستوں میں ان کی نظموں پر تواتر کے ساتھ ، داخلیت، ذات کی طرف مراجعت، حقائق سے ریز اور رومانیت کے الزام لگتے۔ وہ بحث کرتے، اپنی بات منوانے کی کوشش کرتے اور تنقید کی تندی دیکھی سنیں کر چپ ہو جاتے۔ مجھے ابتدا سے قاضی سلیم کی دیت کوشی پسند تھی۔ وہ "کورس" کی یک آہنگ آوازوں سے ہٹ کر اپنی آواز کو پانا اور اس کی پرداخت مانتے تھے۔ جب انھوں نے عملی سیاست کے میدان دم رکھا اور بائیں بازو کی سیاسی پارٹیوں کے محاذ سیکلہ سمیتی کے لیڈر بنے تو چند سیاسی طنزیہ اور بیانیہ نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں بھی انھوں نے اپنی انفرادیت کو رکھا۔ عام طور سے قاضی سلیم کی نظموں کا رویہ رومانی طرز انفرادی اور داخلی، علائم و استعارات ذاتی ہوتے وقت یہ آواز اجنبی تھی اسی لئے ان کی ویسی پذیرائی جیسی ہونی چاہیے تھی۔ اسی سے بددل ہو کر بار بار ے نظمیں چھپوانا بھی ترک کر دیا۔ لیکن ان کے لکھنے کا جاری رہا۔ سنہ ۶۰ء کے بعد شاعری کے لہجے اور محاورے ی جو نمایاں تبدیلی ہوئی وہ ان کی اپنی شاعری کے مزاج سے آہنگ تھی، اس لیے انھوں نے زیادہ مستقل مزاجی سے لکھا بھی اور کلام رسائل میں چھپوانے کی طرف بھی توجہ کی۔ ت سے پہلے "میں سنہ ۵۵ء سے سنہ ۶۰ء تک کی میں جو نظمیں تھیں ان کی اس دور کی رومانی لہجے شاعری کی نمائندگی نہیں کرتیں۔ سنہ ۵۵ء سے سنہ ۶۰ء تک سے صرف گیارہ نظمیں مجموعے میں شریک کی ہیں، ک ان کا لہجہ نمایاں طور پر بدل بھی چکا تھا اور وہ اپنی انفرادیت کو پا بھی چکے تھے۔ باقی ۱۹ نظمیں سنہ ۶۰ء اور سنہ ۶۶ء کے درمیان لکھی گئیں۔ ان کے علاوہ بھی انھوں نے کئی نظمیں لکھیں، مگر افسوس ہوتا ہے کہ انھیں مجموعے میں شامل نہیں کیا۔ ان کی اس دقت پسندی نے ان کی شاعری کے مختلف رنگوں اور لہجوں کو چھپا ہی لیا، اسی کے ساتھ جس طرح آہستہ آہستہ ان کی شاعری کے محاورے اور انداز بیان میں تبدیلی ہوئی ہے اس کے ارتقائی مراحل کا سراغ بھی اس کتاب میں نہیں ملتا۔

اپنی شاعری کا سختی سے انتخاب کرنا بڑے حوصلے اور خود اعتمادی کی دلیل ہے، مگر انتخاب میں ضرورت سے زیادہ سختی کبھی کبھی خود اپنی شخصیت اور فن کی نفی بھی بن جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حال کے اثبات کے لیے سلیم نے اپنے فن کے ماضی اور اس کے تشکیلی دور کو حرف غلط کی طرح مٹا کر اپنے شاعرانہ اور تخلیقی اظہار کے بہت سے امکانات کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اگر وہ پچھلے دور کی نظموں میں سے چند نمائندہ نظموں کو اور بڑھا دیتے تو لہجے کی یکسانیت کی جگہ تنوع بھی پیدا ہو جاتا۔ میری نظر میں تو ان کی وہ نظمیں بھی، جنھیں ان کی نگاہ انتخاب نے نظر انداز کر دیا، نئی شاعری کے بدلتے ہوئے لہجے اور محاورے کی نمائندگی کرنے کے ساتھ رومانیت سے مخالف رومانیت جدید رویے کی طرف ان کے ذہن کے سفر کے اہم نشانات کی حیثیت رکھتی تھیں۔ مجھے اپنے دوستوں میں اس احتیاط اور دقت نظر کی دوسری مثال ڈاکٹر غیب الرحمٰن میں ملتی ہے۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ قاضی سلیم اور غیب الرحمٰن کی شاعری کا مجموعی آہنگ بھی ایک حد تک مماثلت رکھتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ غیب الرحمٰن کا ذکشن غزل بیزاری کے باوجود، فارسی کی شعری روایت میں رچا بسا ہے، جبکہ قاضی سلیم، جو غزل کے سرے سے مخالف ہیں، اپنے ڈکشن میں غزل کی شعری روایت سے بھی نمایاں طور پر منحرف اور منقطع نظر آتے ہیں۔ اسی لئے ان کی شاعری خالص نظم کی شاعری ہے، جو اپنے مواد، طرز احساس، انداز نظر، لہجے اور محاورے کے لحاظ سے اردو کی جدید شاعری میں انفرادیت اور اہمیت کی حامل ہے۔ اس شاعری کی سب سے بڑی خوبی اس کی اعتباریت (AUTHENTICITY) ہے۔ یہ فیشن اور رکلیوں کی پابند شاعری نہیں، بلکہ ایک سوچنے اور محسوس کرنے والے فرد کی اپنے معاصر سماج، خارجی حقائق اور داخلی کشاکش سے آویزش کی عکاسی کرتی ہے۔

(باقی آئندہ)

وحید اختر

میرا صفحہ

کتابیں تو ہر سال سیکڑوں چھپتی ہیں، مگر کچھ کتابیں کسی مخصوص جذباتی وابستگی کی وجہ سے ایسی ہوتی ہیں جن کی ورق گردانی اپنی یادوں کے ورق الٹنے اور پڑھنے کے مترادف ہو جاتی ہے۔ ایسی ہی ایک کتاب مجھے کوئی ڈیڑھ ماہ قبل ملی — قاضی سلیم کی نظموں کا مجموعہ "نجات سے پہلے"۔

اس مجموعے کا انتظار مجھے برسوں سے تھا۔ جس زمانے میں میں 'صبا' کی ادارت سے وابستہ تھا، قاضی سلیم نے اپنے مجموعے کا اعلان "پرتو" کے عنوان سے کیا۔ وہ واقعی اس وقت مجموعہ ترتیب دے رہے تھے۔ یہ مجموعہ کئی برس تک ترتیب، پھر ترمیم اور حذف و اضافہ اور پھر ترتیب کے مراحل سے گزرتا رہا، آخر لوگ بھول بھی گئے کہ اس نام کا کوئی مجموعہ شائع ہونے والا تھا، ایک طویل وقفے کے بعد "شب خون" میں "قاضی سلیم کے مجموعے کا اشتہار چھپا، اب اس کا نام تھا "نجات سے پہلے"۔ مجموعہ ترتیب پا گیا، کتابت بھی ہو گئی، اختر الایمان نے شاعر کا تعارف بھی لکھ دیا۔ صرف کتاب کے پریس میں جانے کا مرحلہ باقی تھا۔ ۱۹۶۹ء میں قاضی سلیم غالب سیمینار کے مشاعرے میں شرکت کرنے علی گڑھ آئے، کتابت کی ہوئی کاپیاں دکھائیں مگر انھیں فکر یہ تھی کہ اختر الایمان نے تعارف میں جن نظموں کے حوالے دئے ہیں، اب وہ شاملِ کتاب نہیں ہیں۔ قاضی سلیم اپنی نظموں سے پوری طرح کبھی مطمئن نہیں ہوتے حالانکہ جب بھی وہ کوئی نئی نظم لکھتے ہیں تو غیر معمولی جوش و خروش کا اظہار کرتے ہیں۔ یوں تو ہر شاعر اپنی ہر نئی تخلیق کو شاہکار سمجھتا ہے، مگر قاضی سلیم کی طرح کوئی دوسرا شاعر اپنے شاہکاروں سے اتنی جلدی بدظن نہیں ہو جاتا۔ ان کی اسی بے اطمینانی کا نتیجہ ہے کہ "پرتو" کے اعلان سے "نجات سے پہلے" تک کی اشاعت کے درمیان تقریباً پندرہ سال کا وقفہ حائل رہا۔ قاضی سلیم سے بہت جونیر شاعر، جنھیں اپنے فن پر اتنی گرفت بھی نہیں، صاحبِ کتاب بنتے چلے گئے، مگر قاضی سلیم اپنی نظموں کے سخت سے سخت تر انتخاب ہی میں پھنسے رہے۔ میں نے ہر مرحلے پر انھیں مشورہ دیا کہ وہ اتنی سختی سے نظموں کا انتخاب نہ کریں کیونکہ اس طرح ان کی شاعری کے مختلف رنگ سامنے نہ آسکیں گے۔ پچھلے بیس برسوں میں شاعری کا لہجہ جس طرح بدلتا رہا ہے، اس کی وجہ سے یہ سمجھ لینا کہ پانچ دس برس پہلے لکھی ہوئی نظمیں پرانی ہو گئیں صحیح نہیں۔ مگر ان کی احتیاط پسندی اور خود اپنی شاعری کے ساتھ سخت گیری کا رویہ برقرار رہا، نہ جانے کس طرح وہ مطمئن ہو پائے جو نومبر میں ان کا مجموعہ بالآخر شائع کر دیا گیا۔ مجھے تو آخر سے یہ اندیشہ ہو چلا تھا کہ صرف ایم۔ ایف حسین کے بنائے ہوئے ٹائٹل کا بلاک ہی کہیں چھپ کر رہ نہ جائے۔

قاضی سلیم کا تعلق اورنگ آباد دکن سے ہے جو ریاست حیدرآباد کی تقسیم کے بعد مہاراشٹر کا ایک حصہ بن گیا۔ وہ پچھلے دس برس سے مہاراشٹر کی قانون ساز کونسل کے ممبر ہیں، جب بحیثیت شاعر و دانشور گورنر نے انھیں نامزد کیا تو ان کے بزرگوں کو پہلی بار شاعری کی "افادیت" کا احساس ہوا، ورنہ ہمارے معاشرے میں جس طرح شاعر کو تو فضول سمجھا جاتا ہے، اس کا اثر قاضی سلیم کے شوقِ شعر پر بھی وقفے وقفے سے ہوتا رہا تھا۔

قاضی سلیم کی شاعری کی عمر تقریباً پچیس برس ہو رہی ہے۔ وہ علی گڑھ میں بی۔ اے کی طالب علمی کے زمانے میں اشعر ملیح آبادی کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم میں سرگرم رہے۔ آزادی کے بعد انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ایل۔ ایل۔ بی کیا۔ اس دوران میں اشعر مرحوم کے ساتھ ایک رسالہ بھی نکالا۔ اس کے علاوہ وہ حیدرآباد سے نکلنے والے ایک رسالے کی بھی ادارت کی۔ ۱۹۵۳ء میں ان سے میری ملاقات ہوئی تو اورنگ آباد اور حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں وہ ایک جانی پہچانی ادبی شخصیت بن چکے تھے۔ پولیس ایکشن سے پہلے کا اورنگ آباد ادب اور زبانِ اردو کا ایک اہم مرکز تھا، بابائے اردو مولوی عبدالحق وہیں تھے، وہیں انجمن ترقی اردو کا مرکزی دفتر تھا، جس سے اس زمانے کے مشہور ادیب، محقق، اور مترحسین وابستہ تھے۔ اورنگ آباد کالج میں بھی اردو کے لکھنے والوں کا ایک قابلِ لحاظ گروہ موجود تھا۔ اس ماحول نے اورنگ آباد کے نوجوانوں میں ادب و شعر کا ذوق، علم کی جستجو اور اردو سے محبت کی وہ روح پیدا کی جس نے شیخ چاند مرحوم اور سکندر علی وجد کی شخصیتوں کو جنم دیا۔ اس ماحول کے باقیات الصالحات پولیس ایکشن کے بعد بھی اورنگ آباد کی فضا میں موثر و سرگرم رہے۔ ۱۹۵۳ء میں جب میں ادبی حلقوں میں ایک نووارد بساطِ ادب کی حیثیت سے روشناس ہوا اس وقت لکھنے والوں کا ایک بڑا حلقہ موجود تھا، وجد ملازمت کے سلسلے میں اورنگ آباد سے باہر رہتے تھے، مگر یعقوب عثمانی اور صدیق جائسی کو پیرانِ مغاں کی حیثیت حاصل تھی۔ عاقل علی خاں، متین سروش، اختر الزماں ناصر، اوصاف علی عباسی ورحم

باقی صفحہ ۱۰ پر

مالک انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ)، پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا